مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں دریاؤں کی تہذیب و معاشرت

Civilization And Society Of Rivers In The Novels Of Mustansar Hussain Tarar

[i] ڈاکٹر سید محمد مبشر رضا نقوی

Abstract:

From pre historic times human beings started living along the banks of river. Great civilization developed besides rivers and when these rivers dried these civilizations also died. Mustansar Hussain Tarar is a renowned novelist of Urdu. His three novels "Rakh", "Bahao", and "Qurbat-e-Marg Main Muhabbat" depicts the civilization, culture and social development in the vast region of rivers. He described the relationship of civilizations and rivers. Old Hakra Indus and river Ravi are symbols of life in this region. People have a hurt full respect with these rivers. These rivers have their full presence in their short stories, myths, proverbs, songs and sub consciousness. Tarar Describes the proses, how a civilization dies when a river dries up. This research article analyses the relationship of river and civilization in the novels of Mustansar Hussain Tarar.

Keywords: *Mustansar Hussain Tarar ,Urdu Novel, Rivers, Civilization, Culture.*

قدیم زمانے سے ہی انسان دریا کے کناروں پر رہنے لگا۔ دریاؤں کے علاوہ عظیم تہذیبنے بھی ترقی کی اور جب یہ دریا خشک ہو گئے تو یہ تہذیبیں بھی دم توڑ گئیں۔ مستنصر حسین تارڑ اردو کے نامور ناول نگار ہیں۔ ان کے تین ناول "رکھ"، "بہاؤ" اور "قربانی مارگ میں محبت" دریاؤں کے وسیع خطوں میں تہذیب، ثقافت اور سماجی ترقی کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہوں نے تہذیبوں اور دریاؤں کا رشتہ بیان کیا۔ پرانا ہاکڑہ سندھ اور دریائے راوی اس خطے میں زندگی کی علامت ہیں۔ لوگوں کو ان دریاؤں کے ساتھ مکمل احترام ہے۔ یہ دریا اپنی مختصر کہانیوں، افسانوں، کہاوتوں، گیتوں اور ذیلی شعور میں اپنی مکمل موجودگی رکھتے ہیں۔ تارڑ نثر کو بیان کرتے ہیں کہ دریا کے خشک ہونے سے تہذیب کیسے مر جاتی ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں دریا اور تہذیب کے رشتے کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: مستنصر حسین تارڑ ، اردو ناول ، دریا ، تہذیب ، ثقافت۔

زمانہ قدیم سے انسان نے دریاؤں کے کنارے بستیاں بنا کر آباد ہونا شروع کیا تو اس کے طرز زندگی میں نمایاں تبدیلی آئی۔ انسان جو فطرتاً شکاری تھا زراعت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دریاؤں پر بند باندھ کر اور ان کے رخ کو موڑ کر، پانی کو اپنی ضرورت کے لیے استعمال کیا۔ رفتہ رفتہ دریاؤں کے کنارے آباد یہ بستیاں شہروں میں بدل گئیں اور دریا کے کنارے انسانی تہذیب کے نئے عہد کا آغاز ہوا۔ یہ دریا اب انسان کے لیے خوراک پیدا کرنے والے تھے، دریاؤں نے ان کے بنجر کھیتوں کو ہرا کیا، سبزہ اور درختوں کی کثرت ہوئی، فصلیں اور پھل پیدا ہوئے اور ساتھ ساتھ انسان مویشی بھی پالنے لگا۔ اب اس کا گزر بسر بھی

[i] استاد، شعبہ اردو، گورنمنٹ علمدار حسین کالج، ملتان

دریا پر تھا۔ انسان نے کشتی بنائی اور پہلی بار کسی دوسری بستی میں وہ پیدل چلے بغیر گیا۔ یوں جلد ہی دریا ان کی زندگیوں میں بنیادی ضروریات سے لے کر عقائد تک میں شامل ہو گیا مگر دریاؤں کے سوکھنے اور مرنے سے ان بستیوں، شہروں اور ان کی تہذیب کو بھی زوال آگیا۔

انسان نے شعور کی بنا پر ترقی کے مدارج طے کیے کسی بھی تہذیب کے فروغ میں ارضی، جغرافیائی اور اقتصادی حالات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انسانوں کی شعوری ترقی کے ساتھ ان کے ہاں فکر و احساس کا نظام قائم ہوا اور سماجی اقدار وجود میں آئیں۔ ہر تہذیب بیرونی اثرات سے بھی متاثر ہوتی آئی ہے۔ کوئی بھی تہذیب جہاں ان عناصر کی وجہ سے تبدیل ہوئی، وہیں ایک بڑا سبب وہاں موجود دریاؤں کا سوکھنا ہے۔ انسان نے فطرت کو اپنے بس میں کرنا چاہا تو اس کے ارد گرد موجود ماحول میں فطرت کا توازن بھی تبدیل ہوا:

> ''انسان میں وہ کیا خوبیاں ہیں جن کی بدولت وہ نہ صرف اپنے آپ کو تبدیل کرتا رہا بلکہ تاریخ کا سفر گواہ ہے کہ اس کا جہاں تک بس چل سکا فطرت کو بھی تبدیل کیا۔ وسیع ریگستان شہروں میں تبدیل کیے۔ دریاؤں پر پُل باندھے، پہاڑوں میں راستے تلاش کیے۔ خانہ بدوشوں سے زراعت اور زراعت سے صنعتی عہد میں قدم رکھا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب وہ اپنی غذا تک پیدا کرنے پر قادر نہ تھا پھر اس نے آلات واوزار تخلیق کیے۔''(۱)

آج پاکستان دنیا کے ان چند ممالک میں سرفہرست ہے جہاں ماحولیاتی تبدیلیاں سب سے زیادہ ہو رہی ہیں۔ خطے میں ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے فصلوں، درختوں، پرندوں، پانیوں کے ذخائر بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ بے وقت کی بارشیں سیلاب لے آتی ہیں یا برسوں بہت کم تعداد میں بارش آتی ہے جس کی وجہ سے گرمی، گرد اور خشکی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں کے دریا اور جھیلیں سوکھتے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے پرندوں، درختوں اور فصلوں کی تعداد میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ غرضیکہ پاکستان میں ماحولیاتی تبدیلی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ یہاں کے شہر دنیا کے آلودہ ترین شہروں میں شمار ہونے لگے ہیں اور زمین کی زرخیزی میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔

دھرتی اور اس سے جڑے مسائل کا حل شاید سائنسی انداز فکر سے طویل وقت میں حاصل ہو گا لیکن ان مسائل کا ادراک ایک ایسی چیز ہے جو اس کے حل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کروا سکتی ہے اور یہ حل ہمارے تخلیق کار کے پاس ہے۔ ایک ناول نگار بدلتے ہوئے حالات کو فوراً محسوس کرتا ہے اور اپنے فن پارے میں اس کا گہرا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ ناول کا تعلق کسی خطے کے طرز معاشرت اور ثقافت سے بہت گہرا ہوتا ہے اس لیے وہ زندگی کی مسائل، بدلتی ثقافت اور ان تصوراتی منطقوں کو سمجھ کر ان کو سماجی و معاشرتی زندگی کو عملی میدان سے جوڑتا ہے۔ یوں ثقافت کسی بھی معاشرت میں تبدیلی کی ابتدا ہوتی ہے لیکن اس معمولی تبدیلی کو کوئی فنکار ہی سمجھ پاتا ہے اور بعد میں اس کے فن کے ادراک کے ذریعے بتدریج یہ جانکاری آگے بڑھتی ہے تہذیب کے حوالے سے احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''تہذیب ایک ملک کے فنونِ لطیفہ اور فلسفیانہ خیالات، طرزِ معاشرت، مادی ترقی اور زندگی کے متضاد اور متصادم عناصر کو متوازن بنا کر اجتماعی زندگی میں ایک خوشگوار احساس پیدا کرنے سے الگ کوئی چیز نہیں۔''(۲)

تہذیب کے ساتھ ہمارے ہاں ثقافت کا لفظ بھی بولا جاتا ہے جس کے مغرب میں معنی ہمیشہ کاشت کے، فصل بونے کے، لیے جاتے رہے ہیں۔ ثقافت کی ضمن میں دریاؤں کا تعلق کسی بھی خطے کی ثقافت اور تہذیب سے گہرا ہے۔ دنیا کے بڑے دریاؤں نے بڑی تہذیبوں کی آبیاری کی اور وہاں کی ثقافت اور معاشرت پر اثر انداز ہوئے۔ اس کا اظہار ہمیں ان خطوں میں لکھنے جانے والے ادب سے ملتا ہے۔ مثال کے طور پر نیل دریا کے جلو میں فراعینِ مصر کی تہذیب پروان چڑھی اور آج نجیب محفوظ اس تہذیب اور دریا کے حوالے سے ''آبِ نیل پہ آوراگی'' لکھتا ہے تو نوبل انعام کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ ہمارے خطے کے دریاؤں کے متعلق ادب میں اظہار اور معاشرتی زندگی پر ان کے اثرات کو دیکھنے سے پہلے ہم ثقافت کی تعریف کو دیکھتے ہیں جو کلچر کے اصل معنی کی وضاحت کرتی ہے۔ کبیر لغت میں کلچر کے حوالے سے یہ رائے ملتی ہے:

> ''Cultine کے معنی اولاً کاشت کرنا۔ دیکھ بھال کرنا شامل تھا زمانہ آگے بڑھا تو اس میں جانوروں کے پالنے کا عمل بھی شامل ہوا۔ پھر انسان میں تعلیم و تربیت کے ذریعے بہتری اور نفاست لانے کے معنی بھی کلچر سے مراد لیے

جانے لگے۔"(۳)

آج اکیسویں صدی کی دو دہائیاں گزرنے کے بعد انسان، زندگی اور ادب کے معنی کسی حد تک نئے اور پرانے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو چکے ہیں۔ اکیسویں صدی سائنس اور روبوٹک ترقی کی صدی بن کر آئی ہے جہاں وہ عام روزمرہ زندگی سے جڑے کام جن کے بارے میں کبھی تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ انسان نہیں بلکہ اس کے لیے مشینیں کریں گی۔ انسانی کی زندگی کی گزران یکسر بدل گئی ہے جس کی وجہ سے اس کے سوچنے سمجھنے، ادب تخلیق کرنے اور ادب سے معنی کشید کرنے کا عمل بھی بدل گیا ہے۔ ایسے میں ادب انسان کو آج کن سوالات کے جواب دے رہا ہے اور اسے آنے والے حالات اور ماحول سے کیسے آگاہ کر رہا ہے یہ بات اہم ہے۔ اس ضمن میں رضی عابدی لکھتے ہیں:

> "ادب شعور کو آگے بڑھاتا ہے آج اگر سیاست غلط راستے پر جا رہی ہے یا سائنس مہلک ہوتی جا رہی ہے اور سماجی ذمہ داریوں سے لاتعلّقی کی وجہ سے ادیب جذبات کو صحیح ترتیب کرنے کی بجائے جذبات کو ہوا دیتا ہے۔ ادب کو ہمیشہ سے زیادہ آج، جب کہ دنیا کو مختلف خطرات کا سامنا ہے اور انسانیت زبردست تذبذب سے گزر رہی ہے یہ سمجھنا ہوگا کہ وہ ادب کو ایک ذمہ داری سمجھ کر تخلیق کرے گا یا اسے صرف جمالیاتی خط تک محدود رکھ کر جمالیات اور دانش کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھتے ہوئے محض تفریح کا ذریعہ بنائے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ ارباب دانش میں شمار ہونا چاہتا ہے یا ارباب نشاط میں۔"(۴)

اکیسویں صدی میں ناول نے ایک نئی کروٹ لی اور ماحول اور سماج کے مسائل کو اپنے اندر سموتے ہوئے ان کے حوالے سے ایک بڑا اور گہرا تجزیہ کیا بلکہ اس سارے منظر نامے کو اس قدر حقیقی انداز میں پیش کیا کہ قاری اس کے سحر سے باہر نہیں آسکا۔ اکیسویں صدی میں اردو دنیا کے جس ناول نگار کو سب سے زیادہ پڑھا گیا وہ مستنصر حسین تارڑ ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں اس عہد کے مسائل کے ساتھ ساتھ اس خطے کی تاریخ، تہذیب و ثقافت بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور سفر

ناموں میں قدیم آثار اور مدفون شہروں کی خاک چھانی ہے۔ خاص طور پر اگر ہم ان کے ناولوں میں ثقافت اور معاشرت کو دیکھیں تو ہمیں ان کے ہاں قدیم سے جدید کا ایک سفر نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں اس خطے میں بہنے والے بڑے دریاؤں کو موضوع بنایا ہے کہ ان دریاؤں کے قریب میں کیسے تہذیب پروان چڑھی اور ان دریاؤں کے پانیوں کے زوال اور سوکھنے سے ان تہذیبوں کو بھی زوال آیا۔ نیز کوئی دریا اپنے قریب رہنے والے لوگوں کے روزمرہ میں کیسے شامل ہوتا ہے وہ ان کی محبت اور عقیدت میں شامل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سجاد نعیم لوگوں کی دریا سے عقیدت کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں :

> ''آج دریائی سفر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک محدود ہو گیا ہے دریا کی سفر میں کشتی سوار اور ملاح دریا کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ کشتی سوار سکے اور چُوری دریا میں پھینکتے ہیں تاکہ سفری مشکلات سے محفوظ رہیں لوگوں کی دریا سے عقیدت گہری ہے۔ وہ دریا کو اپنا پڑوسی، پیر اور پیغمبر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ پالنے والا اور روزی رساں ہے۔ اکثر رسومات کا تعلق بھی دریا سے ہے۔ منتیں دریا پر جا کر مانی جاتی ہیں۔ پوری ہونے پر خیرات بھی دریا کنارے ہی بانٹی جاتی ہے اور سب سے پہلے دریا کو اس کا حصہ دیا جاتا ہے۔ دریا کے باسی سیلاب کے دنوں میں بھی دریا کو چھوڑ کر نہیں جاتے بلکہ دریا کے اترنے کا انتظار کرتے ہیں۔'' (۵)

مستنصر حسین تارڑ کے تین ناول ''راکھ''، ''بہاؤ'' اور ''قربت مرگ میں محبت'' اس خطے میں بہنے والے تین بڑے دریاؤں کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں کئی انکشافات کرتے ہیں۔ ان دریاؤں کی اساطیر، کہانیاں، اعتقادات کو بیان کرتے ہوئے ایک زندگی کو ترتیب دیتے ہیں۔ جو اپنی بھرپور زندگی جی کر مر جاتی ہے، دریاؤں کا پانی گدلا ہو کر سوکھ جاتا ہے اور اس کے قرب میں پلنے والی تہذیب میں کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ ناول نگار کے ہاں گہرے تجربے سے گزرتی ہیں۔ ان ناولوں میں ہم ان دریاؤں کے جینے اور مرنے کی کہانی پڑھ اور سن سکتے ہیں۔ ''بہاؤ'' ناول لکھنے کے خیال کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں :

"دراصل مجھے رات میں اٹھ کر پانی پینے کی عادت ہے میں سائیڈ ٹیبل پر پانی سے بھرا گلاس رکھ لیتا ہوں اور میں شیشے کا گلاس نہیں رکھتا۔ مجھے پکے گلاس میں پانی پینے کی عادت ہے۔ تو وہ بہت گرم رات تھی جب نیم غنودگی میں اٹھ کر پانی پیا تو احساس ہوا کہ گلاس میں میرے اندازے کے مطابق جہاں تک پانی ہونا چاہیے وہ اس سے تھوڑا کم ہے۔ بیرونی حصے میں پانی کی ٹھنڈ یا نمی وہاں محسوس نہیں ہوئی جہاں پہلے ہوا کرتی تھی وہ پہلا موقع کہ بہاؤ کا ابتدائی خیال کہ پانی خشک ہو رہا ہے میرے ذہن میں آیا پھر میں نے ایک آرکیالوجسٹ رفیق مغل کی تحریر پڑھی جو چولستان کے بارے میں تھی اس میں ایک لائن تھی جو مجھے اب بھی یاد ہے "اساطیری دریا سرسوتی ان دنوں چولستان میں بہا کرتا تھا پھر کسی نامعلوم سبب وہ خشک ہو گیا" یہ سطر میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔ میں چولستان گیا وہاں مجھے وہ ٹھیکریاں سی ملیں جنھیں میں نے بعد میں ناول میں استعمال کیا۔ پھر مزید تحقیق کی ناول کی شکل سامنے آئی۔"(۶)

"بہاؤ" میں دریا گھاگھرا کے قریب ایک چھوٹی سی بستی میں لوگ کاشت کاری کرتے، مویشی پالتے اور زمین کو کھود کر زرخیز بناتے ہیں لیکن دریا کے سوکھنے سے ہر طرف خشک سالی ہے، وہاں کی جھیل میں دور دور سے پرندے آکر مرتے ہیں۔ ان پرندوں کی اجتماعی یادداشت میں وہ پانی سے لبالب جھیل ہے جو اب خشک ہو گئی ہے۔ جیسا کہ آج بھی سرحد پار سے ہرنوں کی ٹولیاں دریائے ہاکڑا کی تلاش میں چولستان آتی ہیں اور شکاریوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ ناول میں زندگی اور موت کی کشمکش کو دکھایا گیا ہے۔ پانی حیات ہے اگر پانی نہیں تو صدیوں پرانی بستیوں کے باسیوں کو بھی ہجرت کرنا پڑے گی ورنہ وہاں صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ریت میں دفن ہونے کے لیے رہ جائیں گے۔

"بہاؤ" کی اس بستی کے کرداروں کی زندگیاں دریا کے گرد گھومتی ہیں۔ سمرو اگر مجسمے اور زیور بناتا ہے تو ان میں دریا کا نقش ہے، وہ کسانوں کے لیے زمین کھودنے کے اوزار بناتا ہے تاکہ پانی ان کو سیراب کر کے فصل دے۔ پگلی برتنوں پر فطرت کے نقش ابھارتی ہے یہ کچے پکے برتن بھی دریا کی تہذیب میں رچے

بسے ہیں اس بستی کی ہر چیز جیسے دریائے ہاکڑہ کی دین ہے۔ اس بستی میں خشک سالی حد سے بڑھ جاتی ہے تو ورچن لوگوں کو ہجرت کرنے پر اکساتا ہے لیکن یہ لوگ اس قدر دریا سے جڑے ہوئے ہیں کہ اسے چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کرتے۔ اس بستی میں پرندے مرتے ہیں لیکن بیل اور دوسرے جانور دریا کی عقیدت میں وہیں موجود ہیں اور بڑے پانیوں کا انتظار کر رہے ہیں۔

''بہاؤ'' قدیم زمانوں کے اس دور سے ابھرتا ہے جب عورت معاشرے کا مرکزی کردار ہے۔ وہ مشکل سے مشکل کام کرتی ہے۔ وہ دیوی ہے اور ہندوستان کی اساطیری روایت میں دریا کو بھی دیوی مانا گیا ہے۔ چولستان اور اس کے نواح میں آج کوئی دریا نہیں بہتا لیکن یہاں کے لوگوں کی زندگیوں میں آج بھی دریا کی کہانیاں ہیں، وہ مانتے ہیں کہ ان کا دریا پھر سے لوٹ آئے گا بہاؤ میں اس خطے کی کئی اساطیر کو بھی حصہ بنایا گیا ہے جسے عورتیں کسی پرانے یا سوکھے درخت کو دیکھیں تو اس پر منت کا دھاگا باندھ دیتی ہیں جو اس درخت کو سبزہ، عورت کے بانجھ پن سے نجات اور خطے کو خشک سالی سے بچانے کے لیے ہے۔ ''بہاؤ'' سے یہ اقتباس دیکھیے:

> ''می آؤں۔ میں آؤں، مور بولا۔ اور اس بار وہ پاروشی کو دیکھ کر بولا تھا۔ اس کا اوپر والا ہونٹ دانت سے پرے ہوا اور پیپل کے پتوں میں سے آتی روشنی ان پر لشکی اور وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی۔ جب وہ بانجھ عورتوں کے رکھ کے قریب ہوئی تو پل بھر کے لیے رکی، پیپل کی شاخوں اور خاص طور پر اس کے موٹے اور اوپر اٹھے ہوئے تنے کے گرد بے انت ون سَونے دھاگے بندھے ہوئے تھے ہر دھاگا ایک ایسی عورت نے باندھا تھا جو خشک تھی اور فصل چاہتی تھی اور اپنے آپ کو ہرا بھرا کرنے کی امید پالتی تھی۔''(۷)

''بہاؤ'' میں دریا زندگی کی علامت ہے اگر دریا سوکھ گیا تو وہاں کچھ نہیں بچے گا۔ وہ سب مل کر جتن کرتے ہیں کہ کسی طرح ان کا دریا واپس آجائے۔ پگلی مٹی کے گھڑوں پر مچھلی کے چانے بناتی ہے اور اس کے نزدیک مچھلی چوں کہ دریا کا جانور ہے اس لیے اسے ایسے برتن پر بنانا چاہیے جس میں پانی ہو۔ اس ناول میں کہانی ایک پراسراریت کی طرف مسلسل بڑھتی ہے ایک ویرانی، اداس اور بے رونقی کو پینٹ کرتے ہوئے کئی

کرداروں کے اندر دریا کے جی اٹھنے کی امید بھی مسلسل ساتھ چلتی رہتی ہے۔اس قدیم بستی کے لوگ پرندوں اور جانوروں سے باتیں کرتے ہیں، فطرت سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ وہ فطرت کے ساتھ مل کر رہتے ہیں لیکن ایک دریا کا سایہ انھیں ہر وقت درکار ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر دریا میں پانی نہ آیا تو یہ دنیا ہی ختم ہو جائے گی۔ تارڑ اس خود کے احساس کو قاری تک منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے بھی۔ دریا کے آنے کی امید کے حوالے سے یہ اقتباس دیکھیے:

> ''اس نے ادھر کو جدھر سے یہ لوٹا آیا تھا آنکھیں میچ کر دیکھا۔ دریا کسی بڑھیا کے سینے کی طرح ہموار تھا۔ پاروشنی نظریں جمائے کھڑی رہی دیکھتی رہی اور بہت دیر تک دیکھتی رہی اور تب اس نے بہت دو مٹھی بھر جھاگ کو دیکھا جو ڈولتی ڈولتی اس کی طرف آرہی تھی اور اس کے پیچھے دو مٹھی جھاگ تھی اور اس کے پیچھے۔۔۔۔ وہ فوراً نیچے بیٹھی اور کان پانی کے بہاؤ کے ساتھ لگا کر پورے بدن سے سننے لگی۔ یاں مدھم سی آواز تھی دریا بول رہا تھا۔۔۔۔بڑے پانی آرہے تھے۔''(۸)

''بہاؤ'' دریا کے ساتھ ساتھ ایک پورے عہد، ماحول اور تہذیب کو موضوع بناتے ہوئے دریا کی بقا کی ساتھ وہاں کی تہذیب و معاشرت کو جوڑتا ہے۔ان بستی کے کردار موہن جوداڑو جیسے سہولت یافتہ شہر کی طرف جانے کی بجائے اپنی بستی کی خشک سالی کے ساتھ مرنے کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ وہ فطرت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور اگر یہاں سے گئے تو پھر دریا ہمیشہ کے لیے ان سے ناراض ہو جائے گا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ یہاں زندگی دریا سے مانگی جاتی ہے کوئی بوڑھا ہو جائے تو اسے دریا کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

''راکھ'' میں مستنصر حسین تارڑ نے دریائے راوی کے مرنے کی داستان رقم کی ہے کہ کیسے ٹھہرا ہوا دریا سڑاند مارتا ہے۔ایک بڑے شہر کا بدبودار پانی اس دریا میں مسلسل چھوڑا جارہا ہے جس کی وجہ سے اس دریا میں پلنے والی آبی حیات شدید خطرات سے دوچار ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے راکھ میں ایک دریا کی راکھ اور خشک سالی کو ماحول کے ساتھ جوڑ کر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کو نمایاں کیا ہے۔ نیز وقت کے ایک

خاص وقفے کے بعد دریا میں آنے والی تبدیلیوں سے اس کے نواح میں بسنے والے لوگوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ تارڑ لکھتے ہیں :

> ''چار چیزیں ہیں۔۔۔۔
> ''پانی ہے ؟'' اس نے پوچھا
> ''نہیں۔۔'' ملاح نے جواب دیا
> ''کیا یہ۔۔۔۔ پانی پیا جا سکتا ہے ؟''
> ''نہیں۔۔۔ یہ ٹھہرا ہوا ہے اس میں مچھلیاں اور مینڈک مرتے ہیں اور رات کو سور بھی یہیں آتے ہیں، پینے کے لیے'' (۹)

تارڑ ناول کے آغاز میں ہی راوی کے حوالے سے ایک بیانیہ ترتیب دے دیتے ہیں قادر آباد کے قریب شکار کرتے چند کردار اس دریا کی حالت کے بارے میں ایک مکالمہ کرتے ہیں جس سے قاری اس دریا کے مرنے کے حوالے سے ایک رائے قائم کرلیتا ہے۔ اس رائے سے متعلق یہ اقتباس دیکھیے :

> ''برگیتا کے پانی میں ڈوبے ہوئے جتے کے ساتھ جیسے کوئی سرسراتا سانپ لپٹا اور اس کی کئی زبانیں اس کے ابھار اور پیچ کو چاٹنے لگیں۔ ایک ڈر کی ہچکی اس کے منہ سے نکلی اور وہ نوک دار کانوں والے سیاہ بلے کی طرح ٹھٹھکی اور اس کے ننگے وجود پر خوف سے کانٹے ابھرے اور وہ بڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ابھاروں پر ٹھہرا پانی دریا میں شپ شپ گرا۔ وہ سرسراتی ہوئی شے اس کے پیروں سے لپٹ رہی تھی وہ جھکی اور ڈرتے ڈرتے پانی میں پاؤں کے گرد ہاتھ پھیرا۔ اس کا ہاتھ پانی سے باہر آیا تو اس میں ایک بدبودار پلاسٹک بیگ تھا۔ ایک سیاہ رنگ کا پلاسٹک شاپنگ بیگ اور اس کے ساتھ ہی اسے پہلی بار احساس ہوا کہ پانی میں تیز بو بھی تھی۔'' (۱۰)

''راکھ'' میں دریائے راوی کے سوکھنے سے اور اس کے پانیوں میں شہر کا سیوریج والا بدبودار پانی شامل ہونے سے اس دریا کے کنارے آباد بستیوں کے گیتوں، رواجوں، پہیلیوں اور کہاوتوں میں جو دریا کی

خوشبو تھی، وہ بھی متاثر ہوئی ہے دریا لوگوں کی یادداشت سے نہیں جاتا لیکن ان کے روزمرہ میں دریا نہیں ہے تو راوی کے آس پاس جو تہذیب پروان چڑھ رہی ہے اس میں سے بھی بہت سا حصہ دریا کے ساتھ ہی گم ہو گیا ہے وہ لباس، زیور، برتن، تہوار، جانور، پرندے، موسم اور کشتیاں جو راوی کے پانیوں میں آباد تھیں اس دریا کے ساتھ کہیں کھو گئی ہیں اور یہاں کی ثقافت میں ایک کھوکھلا پن ظاہر ہوا ہے جس میں بیرونی ثقافتیں گھر کر رہی ہیں۔ راوی کا سوکھنا پنجاب کے ایک بڑے حصے میں تنہائی اور خشک سالی لے کر آیا ہے۔

''بہاؤ'' اور ''راکھ'' کے بعد ''قربت مرگ میں محبت'' مستنصر حسین تارڑ کا وہ ناول ہے جو دریا اور اس کے جلو میں پروان چڑھنے والی تہذیب و معاشرت کو موضوع بناتا ہے۔ اس ناول کا مرکز سندھ دریا ہے۔ یہ ناول دریا کے اندر ایک طویل سفر ہے۔ اس سفر کا آغاز غازی گھاٹ ڈیرہ غازی خاں سے ہوتا ہے اور یہ کشتی سمندر کے پانیوں تک جاتی ہے۔ اس ناول میں مور قبیلے، دریائے سندھ اور دریائے سندھ کی اندھی ڈولفن جسے مقامی طور پر بلھن کہا جاتا ہے کے حوالے سے بہت سے قصے، اساطیر اور طرز معاشرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ دریائے سندھ جن علاقوں سے گزرتا ہے یہ علاقے دریائے ہاکڑہ، چناب اور راوی سے یکسر مختلف ہیں اس لیے اس کے کناروں پر مختلف طرح کے ثقافتی مظاہر ہیں۔ غازی گھاٹ کے کنارے جہاں سے سفر آغاز ہوتا ہے وہاں ملاحوں کی بستی کا احوال تارڑ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''سندھ ساگر کے بائیں کنارے پر مہمانوں کی تین کشتیاں،۔۔۔۔ تین کٹیائیں۔۔۔ تین بسیرے۔۔۔ ہولے ہولے ڈولتے تھے اور ان کے قریب ریت میں کڑی دھوپ میں سرکنڈوں کے چند چھپّر تھے، جن کے سائے میں سرور اور پکھی کی نسل کے مہانے۔۔۔۔ بوڑھے بچے اور عورتیں۔۔۔۔ کانبیاں کی شاخوں سے ٹوکرے بُنتے تھے اور لائی کی لکڑی سے پنکھیوں کی ڈنڈیاں تراشتے تھے اور پسینے میں نہاتے تھے۔ ان کے سیاہ بدنوں پر جو دھاریں بہتی تھیں وہ نظر نہ آتی تھیں اور فوراً خشک ہو جاتی تھیں۔''(۱۱)

یوں ناول کے آغاز سے ہی ان لوگوں کی معاشرت اور رسوم و رواج کو دکھایا گیا ہے اور یہ کہ مشکل ترین حالات میں بھی یہ لوگ کبھی دریا کو چھوڑ کر نہیں جاتے۔ ان کی کشتی ہی ان کا گھر ہے جس میں

ضرورت کی اشیاء مثلاً تندور، مرغیاں، بکری، بستر وغیرہ موجود ہوتا ہے۔ یہ اپنی کشتی سمیت دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ کئی دنوں کے بعد کہیں بسیرا کیا جاتا ہے۔ رفعت عباس اپنی یادداشتوں میں دریائی زندگی کے بارے یوں لکھتے ہیں:

> ''دریا پانی سے معمور رہتا، چھوٹی اور بڑی کشتیوں کے پرے تیرتے، سردیوں میں مور قبیلے کی بڑی بڑی جہاز نما کشتیاں لنگر انداز ہوتیں۔ یہ دریائی قبیلہ ان کشتیوں میں رہتا۔ کشتیوں میں ہی ان کے چھوٹے بڑے کمرے جن کے باہر پراسرار رنگین نقوش، منبت کاری اور شیشے کا جڑاؤ دکھائی دیتا۔ ان کی مرغیاں اور بکریاں بھی ساتھ ہوتیں۔ سب سے دلکش بات یہ کہ ان کے تنور بھی کشتیوں کا حصہ ہوتے جب وہ رات کی روٹی پکانے کے لیے تنور روشن کرتے تو لگتا کہ دریا میں آگ لگ گئی ہے۔'' (۱۲)

دریاؤں کے سکڑنے سے ان مہمانوں کا زیادہ وقت اب خشکی پر گزرتا ہے ان کی عورتیں شہروں میں گھروں میں کام کرتی ہیں جب کہ مرد بالکل کوئی کام نہیں کرتے۔ دریا کے کنارے زمین داران کو تنگ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ایک خاص ثقافت جو دریا اور مور قبیلوں کی مشترکہ تھی، اب کھوتی جارہی ہے:

> ''پھر ہمارے ہاں مہمانوں کے ان داتا وڈیرے بھی تشریف کرتے ہیں تو حکم فرماتے ہیں کہ اپنی عورت لاؤ۔۔۔ تو ہم لادیتے ہیں۔
>
> زبردستی کرتے ہیں؟
>
> ناں سائیں زبردستی کس بات کی، یہ ہمارے بھاگ کہ وہ حکم فرمائیں ہمارا کیا جاتا ہے سائیں عورت کا کیا جاتا ہے نہادھو کر پھر کھڑی ہے۔'' (۱۳)

دریا کے قرب میں بسنے والے لوگ جہاں دریا کو روزی رساں سمجھتے ہیں وہیں وہ اس کی تعظیم کسی بزرگ یا پیر کی طرح کرتے ہیں۔ وہ پانی میں تھوکتے نہیں، پیشاب نہیں کرتے حتی کہ دریا کی طرف پیٹھ بھی نہیں کرتے۔ ان لوگوں کا یقین ہے کہ بہتا پانی ہمیشہ پاک ہوتا ہے بلکہ اس پانی میں شفا بھی ہوتی ہے۔ لوگ بیماری کی صورت میں دریا میں نہاتے ہیں اور تندرست ہو جاتے ہیں۔ اگر جسم پر کوئی پھوڑا پھنسی نکلے

تو بھی دریا کے پانی میں نہا کر دریا سے شفا مانگی جائے تو صحت اور تندرستی نصیب ہوتی ہے۔ ''قربت مرگ میں محبت'' سے یہ اقتباس اس کی مثال ہے:

> ''سائیں آپ ذرا ڈھارس رکھو۔ میں نیچے جا کر دریا سے کچھ پانی بھرتا ہوں تمھارے واسطے۔۔۔''
>
> ''نہیں نہیں۔۔۔ وہ تو گدلا اور آلودہ ہو گا'' اسے یاد آیا کہ اس نے سامان کی فہرست میں خاص طور پر منرل واٹر کی بوتلیں لکھوائیں تھیں لیکن برمانی نے ان پر لکیر کھینچ دی تھی۔۔۔ خاور سائیں آپ سندھ سائیں کے پانیوں کی بے عزتی تو نہ کرو۔ آپ کے معدے کو وہ کچھ نہیں کہیں گے بلکہ زیادہ پکا کریں گے۔۔۔ پر سندھ سائیں کے پانی ایسے تھے کہ اسے دیکھ کر اس کا دل کچا ہوتا تھا۔ اس نے مہمانوں کے بچوں کو ان کے کنارے فارغ ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی گدلاہٹ میں بہت کچھ زندہ اور مردہ تیرتا تھا وہ ان عناصر کا جز نہ تھا کہ اس پر اثر نہ کریں۔'' (۱۴)

دریائے سندھ پاکستان کا سب سے بڑا دریا ہے اور خاص طور پر گرمیوں کے موسم میں اس کے منہ زور پانیوں کے آگے کچھ بھی نہیں ٹھہرتا۔ اس کے کنارے آباد بستیاں اکثر دریا برد ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کے گھر، جانور اور کھیت پانی کی زد میں آجاتے ہیں لیکن یہ لوگ دریا سے اس قدر عقیدت رکھتے ہیں کہ نقصان کے باوجود اسے چھوڑ کر نہیں جاتے۔ وہ اپنا نقصان برداشت کرتے ہیں چوں کہ ان کا یقین ہے کہ اگلی فصل بغیر خرچے کے تیار ہو جائے گی۔ وہ ہمیشہ اس کے قرب میں رہنا پسند کرتے ہیں تارڑ نے کہیں دریاؤں کے قرب میں تہذیب کو مٹتے دکھایا ہے تو کبھی معاشرت کے لگاؤ اور بستیوں کے اجڑنے کو بیان کیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

> ''وہ جانتے تھے بلکہ ان کے مکین آگاہ تھے کہ اگلے چند روز میں یا چند ہفتوں میں یہ بھی سندھ کے اجل پانیوں میں گر جائیں گے اس کے باوجود وہ انھیں چھوڑتے نہ تھے۔ اس بستی کے ٹائی ٹینک کے پیندے میں سوراخ ہو چکا تھا اور

پانیوں کا سیلاب اس کے وجود کو ڈبونے کے لیے اندر آرہا تھا لیکن مسافر اسے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔"(۱۵)

دریائے سندھ کے پانیوں کے اسرار کے حوالے سے کئی طرح کی اساطیر اس کے گرد پروان چڑھنے والی تہذیب میں آج بھی سنی جاتی ہیں۔ اس دریا کے کنارے دنیا کی قدیم ترین تہذیب نے جنم لیا مثلاً موہنجوداڑو جیسا شہر جو وادی سندھ کی تہذیب، ثقافت اور جدید طرز معاشرت کی گواہی دیتا ہے۔ اسی دریا کے کنارے دنیا کی طویل تجارت ہوئی۔ اس دریا کے پانیوں کے قرب میں ہزاروں پرندے ہر سال کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس دریا کی اندھی ڈولفن جسے مقامی طور پر مچھیرے بلھن کہتے ہیں۔ انسانوں کے ساتھ ایک عجب رشتے میں جڑی ہوتی ہے اس مچھلی کے حوالے سے طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے "قربت مرگ میں محبت" میں مہمانوں کی زبانی یہ سب باتیں بیان کی ہیں تاکہ اس دریا سے معلق تمام اساطیر کو جانا جائے اور ان پر بحث کی جاسکے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

"ڈولفن۔۔۔

جی سائیں

سائیں بلھن کا پوچھتے ہیں جعفر۔۔۔ فہیم سوتے میں بڑبڑایا۔

"بلھن۔۔۔" ہاں آں بلھن۔۔۔ وہ تو مرضی کی مالک ہے سائیں دیدار نہیں کروانا چاہتی تو اس کے ساتھ زبردستی کون کرے۔ پر ملاپ کے آس پاس ضرور دکھائی دے گی جہاں پانی ملتے ہیں آپس میں۔۔۔ ادھر سندھ کے اندر دونوں طرف سے جب لہریں آتی ہیں تو وہاں ایک علاقہ بنتا ہے جہاں پانی بلکل اطمنان سے ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں جیسے ایک بڑے گھڑے میں ہوں تو ادھر مچھلی آتی ہے اور اسے کھانے کے لیے بلھن آتی ہے۔۔۔ ادھر دیدار کرائے گی۔۔۔"

اندھی ہوتی ہے؟

آنکھیں نہیں ہوتیں پر اندھی تو نہیں ہوتی سائیں قدرت کی مرضی سے جسے

دیکھنا چاہے دیکھتی ہے۔ جسے نہ دیکھنا چاہے نہیں دیکھتی۔ عورت کی مانند!"(۱۶)

دریائے سندھ کے کنارے ملاحوں اور اندھی ڈولفن کے عشق کے قصے معروف ہیں کہ یہ بلھن انسانوں سے محبت کرتی ہے اور چاندنی راتوں میں ملاپ کرتی ہے۔ دریا اپنے قرب میں بسنے والے لوگوں سے محبت کرتا ہے اور ان کا خیال رکھتا ہے۔ صرف انسان ہی نہیں ہزاروں طرح کے پرندے، مچھلی اور دیگر جنگلی حیات بھی یہاں پروان چڑھ رہی ہے دریا پالنے والا ہے۔ اس نے زمانہ قدیم سے یہاں تہذیب کو فروغ دیا۔

"بہاؤ"، "راکھ" اور "قربت مرگ میں محبت" مستنصر حسین تارڑ کے وہ ناول ہیں جس میں انھوں نے دریائے ہاکڑہ، چناب، راوی اور سندھ کے پانیوں کے اسرار کو جانا ہے۔ یہ دریا زمانہ قدیم سے اس خطے میں حیات کے ضامن ہیں انھوں نے تہذیب کو پروان چڑھایا اور اس خطے کے لوگوں کو خوراک، اناج، پانی اور روزگار دیا۔ یہ خطہ سرسبز ہوا اور ان دریاؤں کے جلو میں قدیم بستیاں بنیں لیکن انسان کے لالچ اور ہوس کی وجہ سے آج ان دریاؤں کے پانی سمٹ گئے اور کچھ دریا سوکھ گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس خطے میں انسان اور فطرت کا رشتہ عدم توازن کا شکار ہو گیا ہے۔

دریاؤں کے چلے جانے سے تہذیب کو زوال آرہا ہے۔ وہ لوگ جن کے روز مرہ میں دریا، اس کے گیت، کہاوتیں، محاورے، ضرب الامثال، قصے، سفر اور پانیوں کی خوشبو تھی اب خاک اڑاتے ٹیلے اور میدان ہیں۔ کبھی دریا کے کنارے چرواہوں کے قافلے چلتے تھے، تجارت کی فراوانی تھی آج یہ دریا تنگ آبنائے سے زیادہ کچھ نہیں رہ گئے۔ ان دریاؤں کے سوکھنے سے ایک بڑی تہذیب زوال کی طرف بڑھ رہی ہے جس کی طرف مستنصر حسین تارڑ کے ناول اشارہ کرتے ہیں اور ان وجوہات کو تلاش کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان تہذیبوں کو زوال آیا۔ دریا کیوں سکڑ گئے، دریا کی ایک خطے اور معاشرت میں کیا اہمیت ہے، دریا کا انسانی زندگی کے ساتھ کیا رشتہ ہے، دریا کیسے اپنے نواح میں بسنے والے لوگوں کی زندگیوں میں بدرجہ اتم شامل ہوتا ہے؟ دریا اور انسان کے رشتے کو دریافت کرتے ہوئے دریا کی وجہ سے معاشرت اور ثقافت میں تبدیلی کو مستنصر حسین تارڑ نے عمدگی سے دریافت کیا ہے جو ان کو اکیسویں صدی کے اہم اردو ناول نگاروں میں

شامل کرتا ہے۔ ان کے ناولوں میں اس خطے کے دریا، تہذیب، ثقافت، معاشرت اور بُو باس یہاں کے باسیوں کو وقوع پذیر ہونے والی ماحولیاتی تبدیلیوں سے آگاہ کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر محمد ساجد امجد، اردو شاعری پربرصغیر کے تہذیبی اثرات (کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۹۵ء)، ص۱۸۔

۲۔ احتشام حسین، ''ادبی تہذیبی ورثے کی حیثیت سے''، مشمولہ: ۵۱ء کا بہترین ادب، مرتبہ: سردار احمد جعفری، ممتاز حسین، جگن ناتھ آزاد اور پرکاش پنڈت (دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۵۲ء)، ص۱۷۔

3. Oxford English dictionary vol.3 (oxford: clarendon press, 1978), p 1247-1248.

۴۔ رضی عابدی، ''ادب اور سماجی وابستگی''، مشمولہ: ادب، زندگی اور سیاست (نثری مباحث)، مرتبہ: محمد خاور نوازش (فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص۲۲۷۔

۵۔ ڈاکٹر سجاد نعیم، چناب کنارے (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۱ء)، ص۱۲۔

6. http//:www.urdufiction.com

۷۔ مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص۱۰۔

۸۔ ایضاً، ص۲۵۔

۹۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص۹۔

۱۰۔ ایضاً، ص۵۱۔

۱۱۔ مستنصر حسین تارڑ، قربت مرگ میں محبت (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص۱۱۔

۱۲۔ منور آکاش، مقامی آدمی کا موقف (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء)، ص۱۱۸۔

۱۳۔ مستنصر حسین تارڑ، قربت مرگ میں محبت، ص۲۷۔

۱۴۔ ایضاً، ص۵۵۔

۱۵۔ ایضاً، ص۱۴۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص۱۸۲۔